سورة الدهر

سورة انسان' سورة الدهر' سورة مشاج اور سورة هل اتی بھی کہتے ہیں اس میں ۳۱ آیات ہیں اور جمہور کے نزدیک مدنی سورۃ ہے۔ مقاتل کہتے ہیں کہ مکی ہے اور بعض کو اس کے مکی یا مدنی ہونے میں شک ہے۔ ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ سے مروی ہے کہ یہ مکی ہے حسن اور عکرمہ کہتے ہیں کہ یہ سورۃ۔ فاصبر لحكم ربك سے لیکر كفوراً تک کے علاوہ مدنی ہے۔ ابن کثیر اس سورۃ کی تفسیر میں ابن زید سے روایت لائے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سورۃ 'هل اتی علی الانسان حين من الدهر'' کو پڑھا آپ پر جب یہ نازل ہو رہی تھی تو آپ کے پاس ایک سیاہ رنگت کا شخص بیٹھا تھا جب آپ جنت کی ہریالی کی صفت تک پہونچے تو اس شخص کی روح پرواز کر گئی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''اخرج نفس صاحبكم (يا اخيكم) الشوق الى الجنة'' (جنت کے شوق نے تمہارے ساتھی یا تمہاری بھائی کی روح کو نکال دیا) اور اس نے کہا کہ حدیث مرسل اور غریب ہے۔ امام احمد کتاب الزہد میں روایت لائے ہیں کہ ایک سیاہ رنگت شخص رسول اللہ ﷺ سے تسبیح و تہلیل کے بارے میں اکثر پوچھا کرتا تھا تو اسے عمر بن خطابؓ نے کہا کہ تو نے رسول اللہ ﷺ سے بہت سے سوال کر لئے ہیں جس پر آپ ﷺ نے فرمایا اے عمر رہنے دو پھر رسول اللہ ﷺ پر ''هل اتی علی الانسان'' نازل ہوئی یہاں تک کہ آپ جنت کے تذکرے پر پہونچے تو اس سیاہ رنگت شخص نے ایک جھرجھری لی اور مر گیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ یہ جنت کے شوق میں مر گیا۔ اور ابن عساکر کی روایت میں ہے کہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اس شخص کو قبر میں اتار رہے تھے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

(۱) هَلْ اَتٰى (ترجمہ:۔ یقیناً آیا) علامہ ابوالقاسم ''الموازنة بين ابى تمام والبحترى'' کتاب میں کہتے ہیں کہ مفسرین کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ''هل اتی'' میں ''هل'' بمعنی قد ہے اور نحوین کی ایک جماعت نے بھی اس کی موافقت کی ہے جبکہ اہل لغت تمام کے تمام اس کے خلاف ہیں کیونکہ کلام عرب اور ان کے اشعار میں 'هل قام زيد'' کا جملہ قد قام زيد کے معنی میں نہیں آتا۔ لہذا اس معنی پر بھروسہ کرنا جائز نہیں ہے۔ اور ابو اسحاق' زجاج اور اہل عرب کی ایک جماعت نے کہا کہ اس کے معنی ہیں '' الم يات'' اور یہ بر سبیل تقریر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ زجاج نے کہا ہے کہ جب هل اتی کے جملے کو قد اتی کے معنوں پر کریں گے تو اس کے معنی ہوں گے الم يات على الانسان حين من الدهر یعنی یقیناً ایسا زمانہ آ چکا ہے پس اس معنی کا حاصل یہی ہے کہ هل کا لفظ قد کے معنی میں آتا ہے۔ اور یہ هل کا لفظ مختلف معنی کے لئے آتا ہے۔ کسائی کہتے ہیں کہ هل کو ما کے معنی میں بھی استعمال کرتے ہیں جیسے کہ امراء القیس کا قول ہے۔

و انّ شفائی عبرة مهراقة فهل عند رسم دارس من معول

یہاں هل عندرسم کے معنی ہیں ماعند رسم ۔اسی طرح یہ مصرعہ بھی ہے۔

الاهل اخو عیش لذیذ بدائم

یہاں هل بمعنی ما ہیں۔اوروہ کہتا ہے کہ هل کبھی کبھار خبر بن کر بھی آ تا ہے۔جیسے اللہ نے فرمایا۔ هل اتی علی الانسان۔ اس کے معنی ہیں قد اتی علی الانسان۔اوراس کے معنی ہیں خبر۔فراء کہتے ہیں کہ یہ کبھی شرط بن کراور کبھی قد اور کبھی توبیخ اور کبھی امر اورکبھی تنبیہ کے معنی میں بھی آ تی ہے۔ابن سیدہ کہتے ہیں یوم نقول لجهنم هل امتلأت (ق ۳۰) کے ارشاد باری تعالیٰ میں هل کا لفظ قد کے قائم مقام ہے یعنی قدا متلئت ۔میں کہتا ہوں اسی وجہ سے واحدی نے کہا ہے کہ یہاں هل بمعنی قد کے ہیں اور استفہام کے معنی نہیں ہیں کیونکہ اللہ کی ذات کے لئے استفہام محال ہے۔سیبویہ' کسائی اور فراء اور ابوعبیدہ نے یہی کہا ہے۔امام رازی فرماتے ہیں کہ ھل یہاں استفہام کے معنی میں نہیں ہے اواس کی دو وجوہات ہیں پہلی وجہ یہ ہے کہ ابوبکر صدیقؓ سے مروی ہے کہ جب انہوں نے یہ آیت سنی تو کہا یالیتها کانت تمت فلا تبتلی (کاش تو مر چکا ہوتا پھر تو آ زمایا نہ جاتا) اگر هل استفہامیہ ہوتا تو کبھی بھی یالیتها تمت نہ کہتے۔کیونکہ استفہام کا جواب یا تو نعم کے ساتھ ہوتا ہے یا لا کے ساتھ۔پس جب اس سے مراد خبر دینا ہو تو اس وقت یہی جواب دینا اچھا ہوتا ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات کے لئے استفہام محال ہے۔لہذا اسے خبر پر محمول کرنا ضروری ہے۔میں کہتا ہو ں کہ اللہ کی ذات کے بارے میں تقریری استفہام محال نہیں ہے۔جیسا کہ الست بربكم۔سمین کہتا ہے کہ اسے استفہام تقریری پر محمول کیا جائے گا۔استفہام محض کے لئے نہیں۔ اللہ کی ذات کے بارے میں محال دوسرا استفہام ہے پہلا نہیں۔ **عَلَى الْإِنْسَانِ** (ترجمہ:۔انسان پر) انسان سے مراد آدمؑ ہیں یہی قتادہ' ثوری اور عکرمہ کا قول ہے۔اور ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ انسان سے مراد ہر انسان ہے **حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ** (ترجمہ:۔زمانہ میں سے ایک وقت) یعنی زمانہ کا کچھ حصہ۔ابن سیدہ کہتے ہیں کہ اس میں دهر کی ھا پر فتح پڑھنا بھی منقول ہے۔جس سے مراد بہت طویل عرصہ ہے۔امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ حین کا لفظ مدت دنیا پر بھی واقع ہوتا ہے اور ایک دن پر بھی۔اور ہم حین کی غایت کو نہیں سمجھ سکتے۔اور اسی کی طرح سے زمانه دهر اور احقاب کے الفاظ ہیں۔ازھری کہتے ہیں کہ عربوں کے نزدیک دھر کا لفظ طویل زمانہ کے ایک حصہ پر بھی ہوتا ہے۔اور مدت دنیا پر بھی واقع ہوتا ہے۔جوہری کہتے ہیں کہ دھر سے مراد زمانہ ہے۔اس سے مراد آدمؑ کا چالیس سال تک مٹی میں رہنا ہے۔یہاں تک کہ ان میں روح پھونکی گئی۔ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آدمؑ چالیس برس تک کھنکتی ہوئی مٹی کی صورت میں رہے اور چالیس سال تک گارہ کی مٹی میں رہے پھر اس کے (۱۲۰) سال کے بعد اللہ نے انہیں پیدا فرمایا۔ **لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا** (ترجمہ:۔وہ قابل ذکر شئی نہیں تھا) یعنی اس مدت میں بلکہ اس سے پہلے بھی غیر مذکور شئے تھا۔

(۲) **اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ** (ترجمہ:۔بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا) اس سے مراد آدمؑ کی اولاد ہے **مِنْ نُّطْفَةٍ**

اَمْشَاجٍ (ترجمہ:۔مخلوط نطفے سے) لغت میں **المشج** کے معنی ہیں **الخلط** جب کوئی چیز مخلوط کی جائے تو کہا جاتا ہے کہ **مشج یمشج** ۔ابن الاعرابی کہتا ہے کہ **مشج** اور **مشیج** دونوں واحد ہیں اور اسی سے ہذلی کا یہ شعر ہے۔

کان الریش والفو قین منه خلال الفصل سیّط به مشیج

یعنی وہ تیر کی تعریف کے بعد کہ اس کو اس نے دور تک پھینکا۔ پھر اس کا پھل اور پھل کے اوپر کے حصے تھوڑے سے خون سے خلط ملط ہوئے۔صاحب کشاف کہتے ہیں **امشاج** لفظ مفرد ہے۔جمع نہیں ہے۔اور اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ مفرد کی صفت واقع ہوا ہے۔اور وہ **نطفة امشاج** ہے اور **نطفة مشیج** بھی کہا جاتا ہے اور **امشاج** کا **مشیج** کا جمع ہونا درست نہیں ہے۔ بلکہ یہ دونوں مفرد ہیں ایک جیسے ہیں اس کی کوئی مثال ہے **برمة اعشار** (ٹوٹی ہوئی پتھر کی ہانڈی) اسی طرح **ثوب اخلاق**۔**ارض سباسب**۔ابو حیان کا قول حالانکہ اس کا قول سیبویہ اور نحویوں کی واضح بات کے خلاف ہے کہ افعال کے وزن مفرد نہیں ہوتے۔سیبویہ کہتا ہے کہ کلام میں افعال نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس پر اسم کو جمع کے لئے محمول کیا جائے اور جہاں کہیں بھی مفرد کی صفت افعال کے وزن پر آئی ہے تو انہوں نے اس کی تاویل کی ہے۔فراء کہتا ہے کہ **امشاج** مرد اور عورت کے پانی کے مخلوط ہونے اور خون اور لوتھڑے کو کہتے ہیں۔ابن سکیت کہتے ہیں کہ **امشاج** کے معنی ہیں **اخلاط**۔اس سے مراد نطفہ کا اخلاط ہے۔اس لئے کہ نطفہ کئی انواع سے ممتزج ہوتا ہے یعنی مرکب ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے انسان مختلف طباع والے پیدا ہوتے ہیں۔ابو اسحاق کہتے ہیں کہ **امشاج** کے معنی ہیں منی اور خون کا اخلاط۔پھر ایک حالت سے دوسری حالت پر وہ منتقل ہوتا ہے۔اور مرد کا پانی' عورت کے پانی اور خون کے ساتھ مل جائے تو اسے **نطفه امشاج** کہا جاتا ہے۔اور حضرت علیؓ کی حدیث میں ہے کہ **محط الامشاج من مسارب الاصلاب** (پشت کے سوتوں میں سے مخلوط پانی کی گزرگاہ ہے) اس سے مراد وہ منی ہے جس سے جنین پیدا ہوتا ہے۔اور **محط** کے معنی ہیں امرّ۔اسی وجہ سے معنی یہ ہوں گے ملاوٹ والے نطفہ سے۔**نَّبْتَلِيْهِ** (ترجمہ:۔ہم اسے آزمائیں) یہ **خلقنا** کے فاعل سے حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اس کے معنی ہیں۔ اس کی آزمائش کا ارادہ کرتے ہوئے ابتلاء سے مراد کسی کو مکلّف کرنا ہے۔ **فَجَعَلْنٰهُ** (ترجمہ:۔تو ہم نے اسے بنایا) انسان کو۔ **سَمِيْعًا بَصِيْرًا** (ترجمہ:۔سننے والا اور دیکھنے والا) جب ہم نے اسکی آزمائش کا ارادہ کیا تو اسے احکامات کے لئے سمیع اور طریقہ ہدایت کے لئے بصیر بنایا۔

(۳) **اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ** (ترجمہ:۔ہم نے اسے راستہ دکھادیا) یعنی خیر وشر' سعادت اور شقاوت کا راستہ سمجھا دیا یا تو وہ اس کے قلب میں القاء اور عقل میں انکشاف کے ذریعہ یا سنائی دینے والے قاطع دلائل کے ذریعہ۔ **اِمَّاشَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا** (ترجمہ:۔وہ شکر گذار ہو یا ناشکرا) جمہور نے دونوں جگہوں پر اما میں ہمزہ کے زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔اور ابو لسمال اور ابو العاج نے دونوں مقامات پر ہمزہ کو زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔یہ بھی ایک لغت ہے اسے ابو زید نے اہل عرب سے حکایت کیا ہے۔یہ وہی

ہے جسے بعض لوگ حروف عطف میں شمار کرتے ہیں۔ اور زمخشری کہتے ہیں کہ یہ اچھی قراءت ہے اور وہ کہتا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں ہماری توفیق کے بدولت وہ شکر گذار ہو یا اپنے برے اختیار کی وجہ سے ناشکرا ہے۔ یہ معانی' معتزلہ کے اصول کے مطابق ہیں۔ جہاں تک اس کے معنی شرط متضمن ہو جانے کا معاملہ ہے تو اس صورت میں واجب ہے کہ اس کا جواب ''فا'' کے ساتھ آئے جیسے عرب کہتے ہیں ''اما صدیقاً فصدیق. شاکرا او کفوراً کو ھدیناہ میں منصوب ضمیر کا حال ہونے کی وجہ سے نصب دیا گیا۔ صاحب کشاف کہتے ہیں ان دونوں کا سبیلا سے حال ہونا بھی جائز ہے یعنی ہم نے اسے راستہ سمجھایا یا تو شکر گذاری یا ناشکر گذاری کا۔ جیسے وھدینا ہ نجدین۔ سبیل کو شکر اور کفر کے ساتھ موصوف کرنا مجازاً ہے۔ مکی نے کوفیوں سے حکایت کی ہے کہ اما میں ان شرطیہ ہے اور جس کے بعد ما کا اضافہ ہے یعنی ہم نے اس کا راستہ بیان کر دیا اگر وہ شکر کرے اگر وہ کفر کرے۔ فراء نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ جبکہ اہل بصرہ اسے جائز نہیں رکھتے کیونکہ ان شرطیہ اسماء پر داخل نہیں ہوتی' سوائے اس کے کہ اس کے بعد فعل مضمر ہو اور یہاں پر فعل کا اضمار درست نہیں ہے۔ کیونکہ اضمار فعل شاکراً اور کفوراً کو رفع لازم کرے گا۔ اور شاکراً اور کفوراً کو نصب دینے والے فعل کا مضمر ہونا بھی ممکن ہے پھر تقدیر عبارت یہ ہوگی۔ ان خلقناہ شاکرا فشکور. وان خلقناہ کفوراً فکفور۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شاکراً اور کفوراً کو کان کے مضمر ہونے کی وجہ سے منصوب کیا گیا تو تقدیر عبارت یوں ہوگی۔ سواء کان شاکراً اور کان کفوراً. ان تمام اعراب میں تکلف ہے جس کی ضرورت نہیں جو صاحب کشاف کا نظریہ ہے وہی صحیح ہے اور چونکہ کفر بھی کثیر ہیں اور کفر کے ساتھ متصف ہونے والے بھی کثیر ہیں لہذا صیغہ مبالغہ کے طور پر کفوراً فرمایا گیا۔ برخلاف شکر کے کہ وہ قلیل الوقوع ہے اسی لئے وہاں شاکراً مذکور ہوا ہے۔

(۴) اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا (ترجمہ:۔ یقیناً ہم نے تیار کی ہیں کافروں کے لئے زنجیریں اور طوق اور سخت بھڑکتی آگ) نافع' کسائی' اور ابوبکر نے امام عاصم سے اور ہشام نے ابن عامر شامی سے سلاسلا تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ محض اغلالا اور سلاسل میں تناسب پیدا کرنے کے لئے ہے۔ پھر انہوں نے سلاسل کو منصرف کر دیا اسی وجہ سے نحویوں نے کہا ہے ضرورت اور مناسبت کی وجہ سے غیر منصرف کو منصرف کرنا جائز ہے۔ اخفش کہتے ہیں کہ ہم نے عرب سے سنا ہے تمام غیر منصرف منصرف ہوتے ہیں یہ اس لئے کہ اسماء میں اصل منصرف ہونا ہی ہے۔ اسی طرح کسائی وغیرہ نے اہل کوفہ کے ذریعہ بعض عربوں سے روایت کی ہے اور دیگر اہل بصرہ اور کسائی نے اس کا انکار کیا ہے۔ کیونکہ اسم اگر حرف سے مشبہ ہوگا تو مبنی ہوگا اور معرب اگر بعض وجوہ سے فعل سے مشبہ ہوگا تو اس کا منصرف ہونا ممنوع ہو جاتا ہے۔ پس منع صرف کے اسباب کے باوجود اس کا منصرف ہونا غیر معقول ہے۔ السلسلة ایک چیز سے دوسری چیز کا جڑنا ہے اور یہ لوہے وغیرہ سے معروف حلقے کو کہتے ہیں۔ اور حدیث میں ہے کہ عجب ربک من اقوام یقادون الی الجنة بالسلاسل (تیرا رب ان قوموں سے تعجب فرماتا ہے جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے جنت کی طرف ہانکے جاتے ہیں) کہا گیا ہے کہ یہ وہ قیدی ہیں جنہیں اسلام کی طرف باندھ کر لایا جاتا ہے اس حال میں کہ وہ اسے ناپسند کر رہے

ہوتے ہیں۔ پس وہ ان کے جنت میں جانے کا سبب ہے۔اور غلّ کا لفظ جامع لفظ ہے یہ گردن میں یا ہاتھ میں بھی ڈالا جاتا ہے۔ اوراس کی جمع اغلال ہے۔اس کے علاوہ کسی اور پر اطلاق نہیں ہوتا۔اس معنی اور مفہوم میں رسول اللہ ﷺ کی صفت پر ارشاد الٰہی ہے۔ **ویضع عنهم اصر هم والاغلال التی کانت علیهم** (الاعراف ۱۵۷)(وہ ان سے دور کرتا ہے ان کے بوجھ اور طوق و بیڑیاں جس میں وہ بندھے ہوئے تھے)

(۵) **اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ کَاْسٍ** (ترجمہ:۔ بے شک نیکوکار جام پئیں گے) ابرار وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے بندوں کا حق ادا کرتے ہیں۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابرار وہ لوگ ہیں جو اپنے ایمان میں سچے اور اپنے رب کے مطیع ہیں۔یہی صحیح ہے ''کاس'' لغت میں اس برتن کو کہتے ہیں جس میں شراب ہو جب وہ شراب سے خالی ہو تو اسے ''قدح'' کہتے ہیں۔ابن الاعرابی کہتے ہیں کاس کو کاس اس وقت کہتے ہیں جب اس میں شراب ہو۔ابن سیدہ کہتے ہیں ''کاس'' بذات خود شراب کو کہتے ہیں البتہ عرب کے ''کاسات'' (جام) مختلف اجناس میں سے تھے شیشے کے' سونے کے' چاندی کے اور چینی (مٹی) کے استعداد کے بموجب۔ **کَانَ مِزَاجُهَا کَافُوْرًا** (ترجمہ:۔جس کی آمیزش کافور ہے) جو چیز اس میں ملی ہوگی وہ کافور ہے۔ کافور کے معنوں میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کافور جنت کے چشمے کا نام ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد معروف کافور ہے۔یعنی جنت کا شراب کافور سے ملایا جائے۔اور مشک کی اس پر مہر لگائی جائے گی۔اور بعض کہتے ہیں کافور سے مراد اس کی سفیدی' ٹھنڈک اور اس کی عمدہ خوشبو ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس میں کان زائدہ ہے حالانکہ صحیح یہ ہے کہ یہ زائدہ نہیں ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ اس شراب کا مزاج اللہ کے علم میں کافور ہے۔اور اسے قافور بھی پڑھا گیا ہے۔جیسے قحّ اور کحّ

(۶) **عَیْنًا** (ترجمہ:۔چشمہ ہے) یہ کافور سے بدل ہے کیونکہ اس کا پانی سفیدی میں کافور ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ عیناً کا لفظ کاس کے محل سے بدل ہے۔اور وہ منصوب ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ **یشربون کاساً مزاجها کافوراً عیناً** جام پئیں گے جس کا مزاج چشمۂ کافور ہے) **یَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ** (ترجمہ:۔اس میں سے پئیں گے اللہ کے بندے) یعنی مومن۔زجاج کہتے ہیں کہ بھا میں ''با'' کے معنی من ہے یہی اصمعی' ابوعلی فارسی' قتیبی' ابن مالک کا قول ہے۔عباد کا اللہ کی طرف اضافت کرنا اللہ کے نزدیک ان کے اختصاص کا فائدہ دیتی ہے اور اس کی تائید ابن ابی ابوعلبۃ کی قراءت سے بھی ہوتی ہے اور وہ یوں ہے **یشربها عباد الله** یعنی **یشرب منها عباد الله۔ یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا** (ترجمہ:۔وہ اسے بہالے جائیں گے) یعنی جہاں چاہیں گے اسے لے جائیں گے۔

(۷) **یُوْفُوْنَ**۔(ترجمہ:۔پوری کرتے ہیں) کسائی اور ابوعبیدہ کہتے ہیں کہ **وفیت بالعهد اور اوفیت بالعهد** دونوں ایک جیسے ہیں **بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا** (ترجمہ:۔اپنی نذر اور ڈرتے ہیں اس دن سے جس کی مصیبت ہر طرف پھیلی ہوگی) ان اسباب کے بیان کے لئے یہ جملہ مستانفہ ہے جس کی وجہ سے انہیں مذکورہ ابدی نعمتیں دی جائیں گی ان میں سے

ایفاء نذر بھی ہے اور قیامت کے دن کا خوف بھی ہے۔ اور اللہ کی محبت اور رضا مندی کے لئے کھانا کھلانا بھی ہے۔ جہاں تک پہلے سبب کا تعلق ہے تو نذر سے مراد ہے اپنے نفس پر کسی چیز کا لازم کرنا۔ فراء کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا میں نذر کو پورا کرتے تھے اور کلبی کہتے ہیں کہ وہ اپنے عہد پورا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا ارشاد ہے "اوفو بالعقود" پس انہیں ایفاء کا حکم دیا گیا لہذا ایفائے عہد نذر کے طور پر اس آیت سے واجب ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی ایفائے نذر کے لئے مدح فرمائی۔ قتادہ اور مجاہد کہتے ہیں کہ وہ اسے پورا کرتے ہیں جسے اللہ نے ان پر طاعات واجب فرمایا ہے۔ اور یہ معنی ایفاء کے عمومی معنی کے اعتبار سے ہیں اور ایفاء کے مطلق معنی ہیں ایجاب۔ اور صحیح وہی ہے جو فراء کا نظریہ ہے کیونکہ ایفاء کو جب نذر سے مقید کیا جائے گا تو اس سے عموم مراد نہیں لیا جائے گا۔ اور جہاں تک دوسری وجہ کا تعلق ہے تو اس میں یوم سے مراد یوم القیامة ہے اور شر کے مستطیر ہونے کے معنی ہیں بہت ہی زیادہ پھیل جانا۔ پس جو لوگ قیامت کے دن کا خوف رکھتے ہیں۔ وہ اس کے ڈر کی وجہ سے اس کے مخالف فعل نہیں کرتے۔ اور مخالف وہ لوگ ہیں جن کے دل اطاعت الٰہی سے محروم ہیں اور وہ غیر اللہ میں مصروف رہتے ہیں۔ جہاں تک تیسری وجہ کا تعلق ہے تو وہ یہ ہے

(۸) **وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا** (ترجمہ:۔ اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں) بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علیؓ اور فاطمہؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق اس کا بیان یوں ہے کہ حسن اور حسین بیمار پڑ گئے نبی پاک ﷺ نے ان کی عیادت فرمائی اور دوسرے لوگ آپؐ کے ساتھ تھے آپؐ نے فرمایا اے ابوالحسن اگر بچوں کے لئے نذر مان لیتا تو اچھا تھا پس علیؓ اور فاطمہؓ اور ان کی لونڈی فضہ نے نذر مانی اگر اللہ نے شفاء بخشی تو وہ تین دن روزے رکھیں گے۔ پس وہ دونوں شفایاب ہو گئے اور ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا جس پر حضرت علیؓ سے خیبر کے ایک یہودی شمعون سے تین صاع جو قرض لئے۔ پس فاطمہؓ نے ایک صاع پیسا اور اپنے گھر کے افراد کی تعداد کے مطابق پانچ روٹیاں پکائیں اور روزہ افطار کرنے کے لئے اپنے سامنے رکھا تو اس وقت ایک سائل آ کھڑا ہوا اس نے کہا اے اہل بیت محمد اسلام علیکم۔ میں ایک مسلمان مسکین ہوں مجھے کھانا کھلاؤ۔ اللہ تمہیں جنت کے دسترخوان میں سے کھلائے گا۔ لہذا انہوں نے اس کو ترجیح دی اور پانی کے علاوہ انہوں نے رات بھر کچھ نہ چکھا اور پھر صبح کو روزہ رکھ لیا اور اپنے روبرو کھانا رکھا ان کے پاس ایک یتیم آیا جسے انہوں نے ترجیح دی اور بھوک کی حالت میں رات گذاری پانی کے علاوہ کچھ نہ پیا پھر صبح روزہ رکھا اور جب شام ہوئی اور افطار کے لئے کھانا رکھا تو اچانک ایک قیدی آیا اس نے ان سے سوال کیا تو انہوں نے اسے ترجیح دی۔ جب انہوں نے صبح کی تو حضرت علیؓ نے حسنؓ اور حسینؓ کے ہاتھ پکڑے اور رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ بھوک کی شدت سے پرندے کے بچے کی طرح کانپ رہے تھے آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو میں تمہاری حالت دیکھ رہا ہوں اس سے بڑھ کر اور کوئی شدید ناپسندیدہ بات نہیں ہے۔ یہ فرما کر آپ کھڑے ہو گئے، اور ان کے ساتھ روانہ ہوئے تو آپ ﷺ نے فاطمہؓ کو اپنی عبادت گاہ میں دیکھا کہ ان کا پیٹ پیٹھ سے لگ چکا تھا اور ان کی

آنکھیں دھنس رہی تھیں۔ آپ ﷺ پر یہ بات بہت ہی گراں گذری اس وقت جبرئیلؑ آئے اور کہا لیجئے اللہ نے آپ کو اہل بیت کے بارے میں خوشخبری دی ہے اور پھر اس نے حضور ﷺ کو یہ سورۃ پڑھوائی۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ اللہ نے اپنے نیک بندوں کی تعریف فرمائی ہے اور پھر ان کی صفات بیان فرمائے ہیں کہ وہ نذر پوری کرتے ہیں۔ اور قیامت کے دن سے ڈرتے ہیں بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں پس ان عمدہ صفات سے موصوف لوگوں کا تذکرہ جمع کے صیغے سے ذکر فرمایا گیا ہے۔ پس ان صفات کا کسی معین شخص کے ساتھ اختصاص جائز نہیں ہے۔ اور حضرت علیؑ کا اس میں داخل ہونا ممکن ہے۔ میں کہتا ہوں (قول مفسر علامؒ) کہ جب روایت کے اعتبار سے یہ بات صحیح ہے کہ علیؑ نے منت کو پورا کیا مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلایا اور آپ کے اہل بیت بھوک کی حالت میں تھے تو یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ یہ آیت انہی کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ البتہ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جو شخص بھی ان صفاتِ حمیدہ کے ساتھ موصوف ہوگا تو وہ بھی اس آیت کے عام مفہوم میں داخل ہوگا۔ جیسا کہ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ **وسیجنبها الاتقی الذی یوتی ماله یتزکّٰی** (اللیل ۱۷) آیت مبارکہ ابوبکر صدیقؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے حالانکہ اس کا عام مفہوم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو شخص بھی ایتاء زکوٰۃ سے متصف ہوگا وہ آگ سے مجتنب ہوگا۔ پس اس بارے میں جو امام رازی کا جواب ہے وہی ہمارا بھی جواب ہے۔ امام رازی سے تعجب ہے کہ انہوں نے سیدنا علیؑ کا جہاں بھی ذکر کیا ہے وہاں علیہ السلام کا لفظ ادا کیا ہے۔ اس کے باوجود جہاں کہیں بھی یہ ذکر کیا ہے کہ مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے تو وہ ان روایات کی تضعیف کرنا شروع کر دیتے ہیں اور اس کے معنی میں اوہام وشکوک ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ رویہ نفاق وعناد کے سوا کچھ بھی نہیں۔

(۹) **اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ** (ترجمہ:۔ ہم تمہیں صرف اللہ کے لئے کھلاتے ہیں) یعنی وہ یہ کہتے ہیں ان کا یہ کہنا زبان حال سے یا زبان قال سے۔ **لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ** (ترجمہ:۔ ہم تم سے نہیں چاہتے) یعنی مسکین، یتیم اور قیدی سے **جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا** (ترجمہ:۔ کوئی بدلہ اور نہ کوئی شکریہ) یعنی اس کھلانے پر ہم بدلہ اور شکریہ طلب نہیں کرتے بلکہ ہم نے خالص اللہ کی رضامندی کے لئے کیا ہے۔

(۱۰) **اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا** (ترجمہ:۔ بے شک ہم اپنے رب سے اس دن کا خوف رکھتے ہیں جو نہایت ترش اور بے حد سخت ہے) یعنی بے حد سخت اور ترش دن کے عذاب کا اپنے رب سے خوف رکھتے ہیں۔ **یوم عابس** اور **عبوس** کے معنی ہیں **یومٌ شدیدٌ**۔ صاحب لسان کہتے ہیں کہ اسی سے حدیث ہے کہ عقلمند سخت دن کے خوف کو دفع کرنا طلب کرتے ہیں۔ یہ لفظ اصحاب یوم کے لئے صفت ہے۔ یعنی وہ دن جس میں شدت وسختی کی جائے گی۔ پس اس صفت کو ان پر جاری کیا گیا۔ جیسے کہتے ہیں **لیل نائم** یعنی وہ رات جس میں سویا جاتا ہے۔ ابن الاعرابی کہتے ہیں **یوم مقمطر** اور **یوم قماطر** اور **یوم قمطریر** کا مطلب ہے شدت کی وجہ سے آنکھوں کے درمیان والے حصے کو پکڑنے والا۔ اور یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ دن بہت ہی زیادہ سخت ہو۔ اسی

سے ایک شاعر کا قول ہے۔

بنی عمنا بل تذکرون بلاء نا علیکم اذاما کان یوم قماطر

ایک اور شعر ہے۔

فطرھوا اذا ماالحرب ثارعبارھا وبج بھا الیوم الشدید القماطر

یہاں بجّ کے معنی ہیں شقّ

فراء، ابوعبیدہ، مبرد اور کسائی کہتے ہیں یوم قمطریر اور یوم قماطر اس وقت کہتے ہیں جب بہت ہی سخت دن ہو اور اخفش کہتے ہیں وہ دن جو تمام دنوں میں مصیبت کے اعتبار سے شدید ترین اور طویل ترین ہو۔ تو یوم قمطریر اور یوم قماطر کہا جاتا ہے انس بن مالکؓ نبی ﷺ سے عبوسا قمطریرا کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جو آنکھوں کے درمیان حصہ ہے وہ قبض کر لیا جائے گا معنی یہ ہوں گے آنکھیں دیکھنے کے قابل نہ ہوں گی

(۱۱) **فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ** (ترجمہ:۔ تو اللہ انہیں بچالے گا اس دن کی مصیبت سے) اسے تشدید کے ساتھ (''وقّھم'') بھی پڑھا گیا یعنی مذکورہ صفات کے ساتھ موصوف مومنین کو۔ **وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا** (ترجمہ:۔ اور انہیں تازگی اور فرحت عطا فرمائے گا) کہا جاتا ہے کہ لقّھم کے معنی ہیں اعطاھم۔ یعنی انہیں چہروں میں تازگی اور دلوں میں سرور عطا فرمائے گا۔ پس ان پر نہ تو خوف ہوگا اور نہ گھبرائیں گے۔ ضحاک کہتا ہے کہ نضر کے معنی ہیں چہروں میں چمک اور سفیدی۔

(۱۲) **وَجَزٰىهُمْ** (ترجمہ:۔ اور انہیں عطا فرمائے گا) اسے جازاھم بھی پڑھا گیا ہے۔ یعنی بھوک اور تنگدستی پر ان کے صبر کی وجہ سے انہیں جزا دے گا۔ **بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا** (ترجمہ:۔ ان کے صبر کے بدلے جنت میں ریشمی لباس) اللہ انہیں جنت میں داخل کرے گا اور انہیں ریشم پہنائے گا۔

(۱۳) **مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ** (ترجمہ:۔ اس میں تختوں پر تکیے سجائے بیٹھے ہوں گے) یہ جزاھم کی مفعولی ضمیر کا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ فراء کہتے ہیں اگر آپ چاہیں تو متکئین کو جنۃ کا تابع بھی بنا سکتے ہیں گویا کہ اللہ نے یوں فرمایا وجزاھم جنة متکئین فیھا. اخفش کہتے ہیں کہ اس کا مدح ہونے کی وجہ سے بھی منصوب ہونا جائز ہے۔ صاحب کشاف اور ابو البقاء کہتے ہیں کہ اس کا جنت کی صفت ہونا بھی جائز ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ بصریوں کے نزدیک جائز نہیں ہے جبکہ ضمیر کو ''مبرز'' مانتے ہوئے متکئین ھم کہا جائے گا۔ میں کہتا ہوں اس کا یہ کہنا کہ متکئین جنت کی صفت ہے اس سے مراد متکئین فیھا ولایرون فیھا۔ اب معنی یہ ہیں یعنی جنت جس میں تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے۔ اس صورت میں ھم کو مقدر ماننے کی کوئی حاجت نہیں ہے ارائک اریکة کی جمع ہے اور اریکة کہتے ہیں آراستہ کمروں میں چار پائی کو۔ زجاج کہتے ہیں آراستہ کمروں میں قالین اور

ارائیک کے معنی ہیں تختے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ارائیک کہتے ہیں مزین تختے کو اور جب اس میں تختہ نہ ہو تو اس کو خولة کہتے ہیں۔ **لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا** (ترجمہ:۔ وہ اس میں نہ دھوپ کی گرمی محسوس کریں گے نہ جاڑے کی سردی) یہ جملہ **جزاھم** کے مفعول سے حال ہے یعنی جنت میں سورج کی حرارت اور جاڑے کی برودت (ٹھنڈک) محسوس نہیں کریں گے اور حدیث میں ہے کہ جنت کی ہوا معتدل ہوگی نہ گرمی نہ سردی۔ ابوحیان اس کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ ثعلب نے کہا ہے کہ نبوطے کی لغت میں زمھریر چاند کو کہتے ہیں۔

(۱۴) **وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا** (ترجمہ:۔ اور جھکے ہوں گے ان پر درختوں کے سائے) صاحب کشاف کہتے ہیں کہ یہ محذوف کی صفت ہے یعنی **جنة اخری دانية عليهم ظلالها** ایک اور جنت ہوگی جس کے درخت جھکے ہوں گے یہی ابن سیدہ کا قول ہے پس معنی ہوں گے باغ ان پر سایہ فگن ہوں گے۔ ابن جنی کہتے ہیں کہ دانیۃ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور **متکئین** پر عطف ہے حالانکہ اس میں ظاہری طور پر بعد ہے جس کی ضرورت نہیں ہے۔ زجاج کہتے ہیں کہ یہ جنت کی صفت ہے۔ فراء کہتے ہیں کہ ممدوح ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اسے رفع کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ کہ یہ مقدم خبر ہے اور **ظلالها** اس کا مبتداء ہے۔ اور یہ پورا حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ ابن مسعودؓ نے اسے **دانياً عليهم** پڑھا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ جنت کے درختوں کے سائے ان کے قریب ہوں گے اور ان پر سایہ فگن ہوں گے۔ **وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا** (ترجمہ:۔ اور پھلوں کے خوشے ان کے بالکل قریب کردئے جائیں گے) یہ **دانیہ** پر عطف ہے۔ گویا یوں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ **قطوفها مذللة** اور یہ پورا جملہ **عليهم** کی ضمیر کا حال ہونے کی وجہ سے محل نصب ہے۔ نحاس کہتے ہیں مذلل کہتے ہیں دسترس کے قریب۔ ''ابن قتیبہ'' کہتے ہیں **ذللت** کے معنی ہیں **ادنیت** (قریب کردئے گئے) ابومنصور کہتے ہیں کہ دنیا میں کھجور کے خوشوں کا جھکنا یوں ہوتا ہے کہ جب اس کے شگوفے کھلتے ہیں جن سے وہ ڈھکے ہوئے تھے اس میں قلم لگانے والا اس کی طرف رجوع ہوتا ہے تو اسے نرمی اور آسانی سے پکڑ لیتا ہے یہاں تک کہ چھڑیوں کے درمیان سے باہر جھکا کر ان میں پیوندکاری کر لیتا ہے۔ جس سے گچھوں کا پکنا آسان ہو جاتا ہے۔ ابوحنیفہؒ کہتے ہیں **تذلیل** کے معنی ہیں انگور کے گچھوں کا برابر ہو جانا اور جھک جانا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ **تذلیل** سے مراد ہے اس کے پھل کا چننا آسان ہو جانا اور گچھے کا قریب ہونا۔ **قطوف** اس کا واحد **قطف** ہے۔ یہ چنے ہوئے پھلوں کا نام ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ **قطف** انگور کے خوشوں کو کہتے ہیں **قطافة** اسے کہتے ہیں جو درخت سے گرے یا اسے چنا جائے۔ معنی یہ ہیں کہ جنت کے پھل حاصل کرنے والوں کے لئے قریب ہوں گے۔ پس انہیں بیٹھتے اٹھتے لیٹتے اور کھڑے ہو کر پکڑا جا سکے گا۔ براء بن العاربؓ سے روایت ہے کہ جنتی جنت کے پھلوں کو کھڑے، بیٹھے، لیٹے ہر حال میں جیسا چاہیں گے کھا سکیں گے۔

(۱۵) **وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ** (ترجمہ:۔ اور ان پر دور چلے گا چاندی کے برتنوں اور گلاسوں

کا) یعنی خادم چاندی کے برتنوں کا ان پر دور چلائیں گے۔ اور دوسری جگہ اللہ نے فرمایا "واکواب موضوعة" (الغاشیة ۱۴) وہ چاندی کے ہوں گے یا سونے کے اور انیة کی واحد اناء ہے اس سے مراد بڑے پیالے ہیں اور اکواب کوب کی جمع ہے یہ وہ برتن ہے جس میں دستہ نہیں ہوتا۔ فراء کہتے ہیں کوب' گول سر والے کوزہ کو کہتے ہیں جس کی ٹونٹی نہ ہو۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ابریق اس کو کہتے ہیں جس میں نہ ٹونٹی ہو اور نہ دستہ۔ یہ عام پر خاص کے عطف کی قسم میں سے ہے۔ **كَانَتْ قَوَارِيْرَا** (ترجمہ:۔ وہ شیشے ہوں گے) یعنی ان برتنوں کی حقیقت بلوریں ہوں گی۔ اصل میں قارورہ ریت مٹی کو کہتے ہیں اور اس طرح چاندی بھی حقیقت یہ ہے کہ وہ مٹی ہوتی ہے لیکن اللہ نے بعض صفات کے اعتبار سے دونوں کے درمیان فرق رکھا ہے۔ چاندی میں نرمی ہے اور قارورہ میں سختی اور پہلے میں رطوبت اور دوسرے میں خشکی۔ پس ان دونوں میں اس اعتبار سے تضاد ہے۔ لیکن اللہ نے جنت کے قواریر کو چاندی کی نرمی عطا فرمائی ہے پس ان دونوں متضاد صفات کو باہم یکجا کر دیا یہاں تک کہ جنت کے برتن اپنی بقاء و شرف میں چاندی کی طرح ہوں گے۔ روشنی اور چمک میں وہ قارورہ کی طرح ہوں گے۔ امام طبری اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ نے یہ اس لئے ارشاد فرمایا ہے تاکہ یہ اس بات پر دلالت کرے کہ جنت کی زمین چاندی ہوگی کیونکہ ہر برتن زمین سے بنایا جاتا ہے۔ پس وہاں بھی برتن اسی زمین سے بنائیں جائیں گے جو وہاں ہوگی۔ پس اللہ نے جنتیوں پر دور چلنے والے چاندی سے برتنوں کے وصف کے ذریعہ اس بات پر دلالت فرمائی ہے کہ بندوں کو پتہ چلے کہ جنت کی زمین کی مٹی چاندی کی ہوگی۔ اور اسی سے برتن کی حقیقت اور قواریر کی حقیقت کے مابین اختلاف ہو گیا سوائے اس کے کہ یہ دونوں بعض صفات میں مختلف ہیں جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا۔ نافع' کسائی اور ابوبکر نے دونوں مقامات پر قواریر کو وصل کے ساتھ تنوین والا پڑھا ہے۔ اور وقف کی حالت میں الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حمزہ نے ددنوں مقامات پر بغیر تنوین کے اور بغیر وقف کی حالت کے الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ہشام نے دونوں کو وقف کی حالت میں بغیر تنوین الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن کثیر نے صرف پہلے تنوین میں پڑھی ہے دوسرے پر نہیں اور پہلے پر وقف کی حالت میں وقف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور دوسرے پر نہیں اور ابوعمر' حفص اور ابن ذکوان نے دونوں میں بغیر تنوین کے پڑھا ہے پہلے میں وقف کی حالت میں الف کے ساتھ پڑھا۔ دوسرے میں نہیں۔ قارورة واحد ہے قواریر کا جو کہ زجاج سے ہوتا ہے۔ قارورہ وہ ہوتا ہے جس میں شراب رکھی جاتی ہے۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ شیشے سے نہیں ہوتا اور اس میں الف کا ملانا آیتوں کے سروں کی برابری کے لئے ہے واللہ اعلم۔ عورت کی ایک کنیت قارورة بھی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں وارد ہوا ہے کہ نبی ﷺ نے انجشہ سے فرمایا جب وہ عورتوں کو حدلگا رہے تھے "رفقاً بالقواریر" (شیشوں کے ساتھ نرمی برتو) اس قول سے نبی ﷺ کی مراد عورتیں تھیں۔ یہ محض ان کے ارادوں کی کمزوری اور قلتِ دوام کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ قارورة (کانچ) جلدی ٹوٹتا ہے اور جبر کو برداشت نہیں کرتا۔

(۱۶) **قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ** (شیشے چاندی کے ہوں گے) ابوالبقاء کہتے ہیں کہ حسنِ تکرار اس وجہ سے ہے۔ کہ آیت میں

اگر اس لفظ کی تکرار نہ ہوتی تو پہلا لفظ آیت کا سرانہ بن سکتا تھا۔اس لئے کہ صفت کا موصوف کے ساتھ شدید اتصال ہوتا ہے اور قواریر کا لفظ پہلے سے بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور اسے رفع کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے کہ مقدر خبر کی مبتدا ہے۔یعنی ھی قواریر۔**قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا**۔(ترجمہ:۔وہ انہیں ٹھیک اندازہ کے مطابق بنائے گئے ہیں) جمہور نے قدّروھا قاف کے زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔اور اس میں ضمیر مستتر ان پلانے والوں کی طرف لوٹ رہی ہے جو جنتیوں پر قواریر کے برتنوں کے دور چلائیں گے۔معنی یہ ہیں کہ اس طرح بھرے ہوئے نہ ہوں گے کہ چھلک جائیں اور جو کچھ ان میں ہوگا وہ کم بھی نہیں ہوگا۔پس وہ بھرے ہوئے ہوں گے۔ اور ان میں سے ایک قطرہ بھی نہیں گریگا۔ابن زید کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ انہیں ان کے پینے کی مقدار کے مطابق ٹھیک ٹھیک بھریں گے۔شعبی اور دیگر متقدمین سے مروی ہے کہ انہوں نے قدروھا کو قاف کی پیش اور دال کی زیر کے ساتھ پڑھا مبنی للمفعول معنی یہ ہیں کہ وہ ان پر ٹھیک ٹھیک اندازہ کر دیا جائے گا پس اس میں نہ زیادتی ہوگی اور نہ ہی نقصان اور یہ قراۃ شاذ ہے اس کی نماز میں قراءت جائز نہیں اور نہ ہی اس سے دلیل لینا جائز ہے۔متواتر قراءت پہلی قراءت ہے۔

(۱۷) **وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا** (ترجمہ:۔ اور پلائے جائیں گے اس میں) یعنی جنت میں **كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا** (ترجمہ:۔جام جس کی آمیزش زنجبیل (ادرک) ہے)۔ظاہر یہ ہے کہ جام کو زنجبیل کے ساتھ آمیزش کی جائے گی۔اور عرب اس سے لذت حاصل کرتے ہیں۔اور اسے عورتوں کے منہ کے لعاب کی تعریف میں ذکر کرتے ہیں۔اور جیسا کہ اعشی نے باندی کے لعاب دہن کے ذائقے کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

كان ّالقرنفل والزنجبيل باتا بفيها واريا مشوراً

''الاری'' اسے کہتے ہیں جسے شہد کی مکھی اپنے پیٹ میں جمع کرتی ہے پھر اسے اگلتی ہے اور ''مشور'' اس شہد کو کہتے ہیں جو چھتے سے حاصل کیا جاتا ہے پس یہ شعر اس طرح بھی مروی ہے۔

كانّ جنيّا من الزنجبيل بات بفيها واريا مشورا

صاحب لسان فرماتے ہیں کچھ لوگوں کا گمان ہے کہ شراب کو زنجبیل کہا جاتا ہے اور کہتے ہیں کہ زنجبیل خوشبودار مائع ہوتا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ جنت کی شرابوں میں سے زنجبیل ہو نیز یہ بھی جائز ہے کہ اس کی آمیزش زنجبیل ہو' قتادہ اور مجاہد کہتے ہیں کہ زنجبیل چشمے کا نام ہے اور مقاتل کہتے ہیں کہ وہ دنیا کی زنجبیل کے ساتھ مشابہ نہیں کیونکہ اس میں تیزی اور ترشی ہوتی ہے اور جنت کی زنجبیل میں تیزی' ترشی نہیں ہوگی۔

(۱۸) **عَيْنًا** (ترجمہ:۔چشمہ ہے) کہا گیا ہے کہ زنجبیل سے بدل ہے اور ایک قول یہ ہے کہ مقدر فعل کی وجہ سے منصوب ہے یعنی یسقون عیناً اور نزع الخافض کی وجہ سے بھی منصوب ہونا جائز ہے یعنی من عین. **فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا** (ترجمہ:۔اس

میں جسے سلسبیل کہا جاتا ہے) اور سلسبیل شراب لذیذ ہے۔ زمخشری کہتے ہیں کہ ترکیب میں ''ما'' کا اضافہ کر دیا گیا ہے یہاں تک خماسی لفظ بن گیا۔ جو کہ غائت سلاست پر دلالت کرتا ہے۔ ابن الاعرابی کہتے ہیں میں نے قرآن کے علاوہ سلسبیل کا لفظ نہیں سنا۔ عبد اللہ بن رواحہ کہتے ہیں۔

انعم عند ربهم فی جناں یشربون الرحیق والسلسبیل

زجاج کہتے ہیں کہ سلسبیل ایک چشمے کا نام ہے اور لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جو انتہائی سلیس ہو گویا چشمہ کو اس کی صفت کی وجہ سے وہی نام دے دیا گیا۔ سیبویہ نے بھی کہا ہے کہ یہ صفت ہے اور حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں اس کے معنی ہیں وہ جو جنتیوں کے حلق میں خود بخود ٹپکتا رہے گا۔ امام ابو جعفر محمد بن علیؒ فرماتے ہیں کہ نرخرہ اور حلق کے درمیان کی نرمی۔ عین سلسل' عین سلسال اور عین سلسبیل تینوں طرح کہا جاتا ہے۔ اس کے معنی ہیں میٹھا اور حلق میں آسانی سے اترنے والا۔

(۱۹) وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ (ترجمہ:۔ اور آتے جاتے رہیں گے ان کے پاس) یعنی شراب کے ساتھ وِلْدَانٌ (ترجمہ:۔ لڑکے) یہ واؤ کی زیر کے ساتھ ہے یہ ولید کی جمع ہے ولید اس لڑکے کو کہتے ہیں جو نابالغ ہو۔ ابوالہیثم کہتے ہیں کہ ولید نوجوان کو کہتے ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا کہ یہ وہ لڑکے ہیں جنہیں اللہ نے جنتیوں کی خدمت کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور بعض نے کہا کہ یہ مومنین کے بچے ہوں گے اور ابن برحان نے کہا واللہ اعلم وہ کفار کے بچے ہوں گے جس طرح وہ دنیا میں خدمت کرتے تھے۔ البتہ مومنوں کے بچے اپنے آباء کے ساتھ ملا لئے جائیں گے۔ اس بارے میں پہلا قول ہی صحیح ہے۔ مُّخَلَّدُوْنَ (ترجمہ:۔ ہمیشہ رہنے والے) یعنی جنت میں۔ نہ تو بوڑھے ہوں گے اور نہ ہی متغیر۔ عرب اس شخص کو جس کے بڑھاپے کے باوجود دانت اور داڑھیں سلامت رہیں یا اس کے بالوں کی سیاہی برقرار رہے اس کے لئے کہتے ہیں انه مخلد۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ ثابت الحال ہے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مریں گے نہیں کیونکہ جب ایک حالت پر رہیں گے۔ بڑھاپے' سفیدی اور موت کے ذریعہ متغیر نہیں ہوں گے۔ تو وہ مخلّد ہی ہوں گے۔ اِذَا رَاَيْتَهُمْ (ترجمہ:۔ جب آپ انہیں دیکھیں گے) اے محمد ﷺ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا (ترجمہ:۔ تو انہیں بکھرے ہوئے موتی گمان کریں گے) یعنی جب ان لڑکوں کو آپ انہیں اپنے اعمال ومشاغل میں متفرق دیکھیں گے تو آپ ﷺ انہیں ان کی کثرت اور چہروں کی سفیدی اور خوبصورتی کی وجہ سے بکھرے ہوئے موتی گمان کریں گے۔ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ ہر جنتی کے پاس ایک ہزار لڑکے خدمت گذار ہوں گے وار ہر لڑکے کا عمل اپنے ساتھی کی خدمت سے مختلف ہوگا۔ اللہ نے موتی کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اس لئے کہ عرب حد درجہ حسن وجمال والے شخص کو موتی سے تشبیہ دیتے ہیں اور ان کے اشعار خوبصورت عورتوں کی موتی کے ساتھ تشبیہات سے بھرے ہوئے ہیں۔

(۲۰) وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ (ترجمہ:۔ اور جب آپ وہاں نظر اٹھائیں گے) یعنی جنت میں اور خطاب نبی ﷺ کو ہے۔

رَاَیۡتَ نَعِیۡمًا وَّمُلۡکًا کَبِیۡرًا (ترجمہ:۔تو آپ نعمت اور بہت بڑی بادشاہت ہی دیکھیں گے۔) یعنی وسیع' لا متناہی'
(۲۱) عٰلِیَهُمۡ (ترجمہ:۔اوران کے اوپر) نافع' حمزہ اور ابن محیصن نے اسے ''یا'' کے سکون اور ''ھا'' کے زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔اس لئے کہ یہ خبر مقدم ہے۔ثیاب سندس مبتداء ہے۔اخفش نے کہا ثیاب فاعل کی ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور فراء کہتے ہیں کہ یہ متبداء ہے اور ثیاب خیر ہے۔باقی قراء نے اسے ''یا'' کی زبر اور ھا کے پیش کے ساتھ پڑھا ہے۔فراء کہتے ہیں کہ جس نے اسے فتح دی ہے اس نے گویا اسے صفت قرار دیا ہے۔یعنی فوقھم اور کہتا ہے کہ عرب کہتے ہیں ''قومک داخل الدار'' پس وہ داخل کو نصب دیتے ہیں کیونکہ وہ نصب کا محل ہے۔پس عالیھم کا لفظ بھی اسی قسم سے ہے اور زجاج کہتے ہیں کہ ہم عالی کے لفظ کو ظروف میں سے نہیں جانتے۔شائد فراء نے عالی کو بطور ظروف سنا ہو۔اگر یہ ظرف ہوتا تو اس کی ''یا'' کو ساکن کرنا جائز نہ ہوتا لیکن اس کی نصب دو چیزوں سے حال ہونے کی وجہ سے ہے ان میں ایک یطوف علیھم میں ھا اور میم۔پھر فرمایا عالیھم ثیاب سندس یعنی اس حال میں کہ ان پر کپڑے ہوں گے۔اور دوسرا یہ کہ ولدان سے حال ہو۔اس صورت میں نصب واضح ہے۔جس نے عالیھم پڑھا ہے اس نے اسے مبتداء ہونے کی وجہ سے رفع دی ہے نیز عالیتھم زبر کے ساتھ اور عالیتھم پیش کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔اور یہ دونوں قرأۃ مصحف کے خلاف ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہیں نیز علیھم بھی اسے پڑھا گیا ہے۔اور یہ قراءت معنی کے اعتبار سے بالکل واضح ہے۔ ثِیَابُ سُنۡدُسٍ خُضۡرٌ وَّاِسۡتَبۡرَقٌ (ترجمہ:۔باریک ریشم کے سبز کپڑے اور دبیز ریشم کے) حدیث شریف میں ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت عمر فاروقؓ کی طرف باریک ریشم کا جبہ بھیجا۔مفسرین کرام کہتے ہیں کہ سندس رقیق اور اعلیٰ درجہ کے دیباج کو کہتے ہیں اور استبرق موٹے دیباج کو کہتے ہیں۔اور اہل لغت ان کے معرب ہونے میں کوئی اختلاف نہیں رکھتے۔نافع اور عاصم نے خضرو استبرق کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔اور کسائی اور حمزۃ نے دونوں کو زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔اور ابن کثیر نے خضر کو زیر کے ساتھ اور استبرق کو پیش کے ساتھ پڑھا۔اور ابوعمرو عبداللہ بن عامر شامی نے خضر رفع کے ساتھ اور استبرق کو زیر کے ساتھ پڑھا۔نحوی حضرات کہتے ہیں کہ ثیاب کی صفت ہونے کی وجہ سے خضر کا مرفوع ہونا جائز ہے۔اور سندس کی صفت ہونے کی وجہ سے اس کا مجرور ہونا بھی جائز ہے۔ وَّحُلُّوۡۤا اَسَاوِرَ مِنۡ فِضَّۃٍ (ترجمہ:۔اور انہیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے) اللہ نے سورۃ الکھف میں فرمایا ہے یحلون فیھا من اساور من ذھب پس معنی یہ ہوں گے کہ انہیں سونے اور چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان دونوں میں کوئی منافات بھی نہیں ہے۔ السّوار ' السُّوار کہتے ہیں عورت کے کنگن کو اس کی جمع اسورۃ اور اساور ہےاور ابواسحاق کہتے ہیں کہ اساور' اسورۃ کی جمع ہے اور اس کی جمع ''اسوار'' بھی کبھی کبھی آتی ہے سیبویہ کے مطابق حسب ضرورت۔ وَسَقٰهُمۡ رَبُّهُمۡ شَرَابًا طَهُوۡرًا (ترجمہ:۔اور ان کا رب انہیں پاکیزہ شراب پلائے گا) ابوزید کہتے ہیں کہ شراب ہر پی جانے والی شئے کو خواہ کسی بھی نوع کی ہو اور کسی بھی حال میں ہو۔ابوحنیفہ کہتے ہیں شراب' مشروب' شریب تینوں ایک ہی ہیں۔اور یہ بات ابوزید کی طرف

منسوب ہے۔اس اعتبار سے شراب سے مراد خمر نہیں ہے۔کیونکہ اس معنی کے اختیار کرنے کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے۔اگر چہ عام مفہوم کے تحت وہ بھی اس میں داخل ہے۔کیونکہ اس چیز کو کہتے ہیں جو پی جاتی ہو۔لیکن خمر ایسی چیز نہیں ہے جو صرف پی جاتی ہو بلکہ یہ وہ شئے ہے جو عقل کو بھی ڈھانپ دیتی ہے۔اور وہ شراب جو انہیں اللہ پلائے گا وہ عقول کو ڈھانپنے والی جنس سے نہیں ہوگی۔اسی لئے اس کی صفت ''طھور'' لائی گئی۔طھور مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی اس میں حد درجہ طہارت اور بہت زیادہ نظافت ہوگی۔ازہری کہتے ہیں کہ طھور لغت میں اسے کہتے ہیں جو ظاہر بھی ہو اور مظہر بھی۔کیونکہ طہور تبھی ہوگا جب اس کے ذریعہ طہارت حاصل کی جائے گی۔جیسے وضوٗ اس پانی کو کہتے ہیں جس سے وضو کیا جاتا ہے۔اور ''نشوق'' وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ ناک صاف کی جاتی ہے۔اور ''فطور'' اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ روزہ افطار کیا جاتا ہے پینے کی چیز ہو کہ کھانے کی۔رسول اللہ ﷺ سے دریا کے پانی کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ پاک ہے اور اس میں مری ہوئی چیز حلال ہے یعنی مطہر ہے۔پس جب یہ شراب طہور ہے تو اس کا طاہر اور مطہر ہونا بھی ضرور ی ہے۔ابو قلابہ اور ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ انہیں طعام دیا جائے گا اس کے آخر میں شراب طہور دی جائے گی۔جسے وہ پئیں گے تو ان کے پیٹ ہلکے ہو جائیں گے۔اور مشک کی بو کی طرح ان کے بدن سے پسینہ بہے گا۔امام رازی کہتے ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ ''وسقاھم ربھم'' کا قول عین وہی قول ہے جو اللہ نے اس سے پہلے فرمایا ہے کہ انہیں کافور زنجبیل اور سلسبیل کے چشمے سے پلایا جائے گا۔یا یہ کوئی اور نوع ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ یہ دوسری نوع ہے۔اس لئے کہ اللہ نے اسے اپنی ذات کی طرف اضافت کرتے ہوئے فرمایا ہے'' وسقاھم ربھم''اور یہ بات اس دوسرے کے مقابلہ میں اس شراب کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے اس کے علاوہ بھی دیگر وجوہات بھی ذکر فرمائی ہیں۔

(۲۲) اِنَّ ھٰذَا (ترجمہ:۔بے شک یہ) یعنی جسے اللہ نے جنت کی نعمتوں وغیرہ میں سے ذکر فرمایا ہے۔ کَانَ (ترجمہ:۔رہی) اللہ کے علم میں لَکُمْ جَزَآءً (ترجمہ:۔تمہارا بدلہ) یعنی تمہارے اعمال کا بدلہ جسے اللہ نے فضل ورحمت سے عطا فرمایا۔ورنہ بندے کے اعمال اسے دنیا میں اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کے مقابلہ میں بھی کس شمار میں ہیں کیونکہ ان نعمتوں میں سے کسی ایک بھی نعمت کے مقابلہ میں عمر بھر شکر کرنا اور اس کے تمام اعمال کافی نہیں ہو سکتے۔وَکَانَ سَعْیُکُمْ مَّشْکُوْرًا (ترجمہ:۔اور تمہاری کوشش کامیاب ہوئی) یعنی اس کی عبادات کے لئے دنیا میں تمہارا عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔لہذا اس نے اپنے لطف وفضل سے تمہاری اس طاعت کو قبول فرمالیا۔

(۲۳) اِنَّانَحْنُ نَزَّلْنَاعَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِیْلًا (ترجمہ:۔بے شک ہم نے قرآن آپ پر تھوڑا تھوڑا نازل فرمایا) جب اللہ نے بطور ایجاز کافروں کے احوال کو بیان فرمایا اور مومنین کے ثواب کو تفصیلی طرح پر واضح فرمایا تو پھر سے کفار کے احوال کی طرف رجوع کیا اور ان کفار میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کاہن ہیں اور ساحر ہیں۔جس نے اپنی کہانت

اور جادو سے اس قرآن کو گھڑ لیا تو اللہ نے ان کا رد فرمایا اور ارشاد فرمایا۔ اور فرمایا بے شک ہم نے قرآن کو آپ پر حسب حکمت و مصلحت تھوڑا تھوڑا نازل کیا ہے۔ پس آپ اپنے قلب مبارک کو ثابت رکھئے۔ اور اس ایذاء پر صبر کیجئے اور ان کی باتوں سے اپنے قلب میں تنگی محسوس نہ کیجئے۔ اور یہاں پر جملہ اسمیہ کو موکد لایا (حرف تاکید کے ساتھ) گیا ہے۔ اور وہ ہے **نحن نزلنا** اور اس کے بعد فعل کو مصدر کے ساتھ موکد کیا گیا ہے۔ اور یہ محض کفار کے انکار اور ان کے اس اصرار کا رد ہے کہ قرآن اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ سب سے زیادہ بلیغ کلام ہے۔

(۲۴) **فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ** (ترجمہ:۔ تو آپ اپنے رب کے فیصلے کے لئے صبر فرمائیں) یعنی اس کی قضاء کے لئے پس وہ آپ کو اپنی تقاضہ حکمت کے مطابق آپ کی مدد فرمائے گا۔ **وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا** (ترجمہ:۔ اور ان میں سے کسی گنہ گار ناشکرے کی بات نہ مانیں) صاحب کشاف کہتے ہیں کہ گناہ گار عتبہ ہے اور ناشکرا ولید ہے۔ کیونکہ عتبہ بہت زیادہ گناہ کرنے والا اور کئی قسم کے فسق کرنے والا تھا اور ولید کفر میں غالی تھا۔ مروی ہے کہ عتبہ بن ربیعہ نے رسول ﷺ سے کہا آپ اس معاملہ سے رجوع کرلیں۔ میں آپ کو اپنی بیٹی بیاہ دوں گا اور میں قریش میں سب سے زیادہ بیٹیوں والا ہوں اور ولید نے کہا میں آپ کو مال دوں گا یہاں تک کہ آپ خوش ہو جائیں گے اور میں قریش میں سب سے زیادہ مالدار ہوں۔ جس پر رسول اللہ ﷺ نے ان پر حم سجدہ کی ابتدائی دس آیات **فان اعرضوا فقل انذر تکم صاعقة مثل صاعقة عاد وثمود** تک تلاوت فرمائیں تو وہ دونوں وہاں سے چلے گئے اور ان میں سے ایک نے کہا کہ مجھے گمان ہوا کہ کعبہ عنقریب مجھ پر گرنے والا ہے۔ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ آثم اور **کفور** کے الفاظ مطلق ہیں کسی معیّن شخص سے مقید نہیں۔ امام رازی فرماتے ہیں یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے۔ زجاج کہتے ہیں کہ اکیلے واؤ سے الف زیادہ موکد ہوتا ہے کیونکہ جب آپ یہ کہیں **لا تطع زیدا وعمرا** پھر اس نے کسی ایک کی اطاعت کرلی تو عاصی نہیں ہوگا کیونکہ آپ نے اسے دونوں کی اطاعت نہ کرنے کا حکم دیا تھا پس جب اللہ نے آثما اور **کفورا** فرمایا تو یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک اس بات کا اہل ہے کہ اس کا کہا نہ مانا جائے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ جب آپ کہتے ہیں **لا تخالف الحسن او ابن سیرین** تو گویا آپ نے یوں کہا ہے کہ یہ دونوں اس بات کے اہل ہیں کہ ان کی تابع داری کی جائے۔ فراء کہتے ہیں کہ یہاں پر ''او'' کا لفظ ''لا'' کی طرح ہے گویا ارشاد فرمایا گیا ہے ''**ولا کفورا**'' پس معنی یہ ہوں گے کہ آپ ان میں ہر اس شخص کی اطاعت نہ کریں جو اثم اور **کفور** سے متصف ہو بلکہ آپ ان سے منہ موڑ لیں۔

(۲۵) **وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا** (ترجمہ:۔ اور اپنے رب کا نام صبح و شام یاد کریں) **البکرة** یعنی صبح کی نماز اور اصل یعنی ظہر اور عصر کی نماز۔ امام رازی نے کہا کہ اللہ کے اس قول ''**واذکر اسم ربک**'' سے مراد نماز نہیں بلکہ تسبیح ہے جو کہ قول اور اعتقاد ہے۔ اور مقصود یہ ہے کہ کل اوقات میں رات دن قلب و زبان سے آپ سے اللہ کا ذاکر بنے رہنے کے لئے کہا جا رہا ہے

اور یہی اللہ کے ان ارشادات سے مراد ہے ۔ یا یھا الذین آمنوا اذکروا اللہ ذکرا کثیراً و سبحوہ بکرۃ واصیلاً (الاحزاب ۴۱) یہاں "اسم ربک" فرمایا اور دوسرے مقام پر "اذکر اللہ" اور ایک جگہ "فاذکرونی" ارشاد فرمایا۔ (اسم ربک) اس میں ذاکر کے لئے اشارہ ہے کہ وہ اسماء اور صفات کی معرفت حاصل کرے اور ان کی قدر و منزلت سے واقف ہو اور ان کے کمالات کا ادراک کرے۔ "فاذکرونی" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کا عرفان نقطہ وحدت تک پہونچ جائے۔ اور جہاں تک اس کے اوپر کا تعلق ہے تو وہ ایک ایسا مرتبہ ہے جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں" اور اس کی جانب یہ اشارہ قطع کرتا ہے پس یہ مرتبہ غیب ہے اور ممکن نہیں کہ عبد کا عرفان وہاں تک پہونچے۔ اس اس کی جانب نبی ﷺ نے فرمایا "ماعرفناک حق معرفتک" (ہم سے تیری معرفت کا حق ادا نہیں ہوا) پس کسی کو بھی اس کی حقیقت کا کنہ حاصل نہیں ہوسکتا کسی بھی جہت سے۔

(۲۶) وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْلَهُ (ترجمہ:۔ اور رات میں اس کے لئے سجدہ ریز ہو) یعنی رات میں اللہ کے سامنے سجدے کرو۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد صلوۃ المغرب اور عشاء ہے۔ پس یہ آیت پانچوں نمازوں کے لئے جامع ہوگئی ہے ان لوگوں کے نزدیک جنہوں نے کہا کہ ذکر سے مراد صلوٰۃ ہے وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا (اور اس کی تسبیح کرو رات کے طویل حصہ میں) اور اس سے اکثر لوگوں کی مراد تہجد ہے۔ اور " سبحہ "امر ہے اور یہ واجب ہے پس اسی سے یہ دلیل ملتی ہے کہ یہ تہجد رسول اللہ ﷺ پر واجب تھی اور یہی اکثر کا مذہب ہے اور بعض نے کہا کہ تسبیح سے مراد تطوع ہے۔

(۲۷) اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ (ترجمہ:۔ بے شک وہ لوگ دنیا سے محبت کرتے ہیں) اور ان لوگوں سے مراد کافر ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں انہیں حاصل ہونے والی نعمتوں سے پیار کرتے ہیں۔ اور اس کی فنا ہونے والی لذتوں میں کھوئے رہتے ہیں۔ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ (ترجمہ:۔ پس پشت ڈال دیتے ہیں) جو آنے والا ہے۔ يَوْمًا ثَقِيْلًا (ترجمہ:۔ ایک بھاری دن) پس وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے۔ بلکہ اس کو بھلا دیتے ہیں کیونکہ وہ یوم قیامت حشر و نشر پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ یوم کی صفت ثقیل بیان کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ دن کافروں پر شدید ہوگا۔

(۲۸) نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ (ترجمہ:۔ ہم نے انہیں پیدا کیا) ہمارے سوا کسی اور نے نہیں۔ وَشَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ (ترجمہ:۔ اور ہم نے ان کے خلق کو مضبوط بنا دیا) والاسر کلام عرب میں الخلق کے معنی میں مستعمل ہے۔ فراء نے کہا "اسر فلان" کے معنی ہیں حسن الاسر یعنی بناوٹ کو عمدہ کیا' اسر اللہ یعنی اس کی تخلیق کی اور کہا جاتا ہے کہ اسر کے معنی ہیں شدۃ الخلق۔ کہا جاتا ہے رجل ما سور وما طور یعنی شدید المفاصل والاوصال۔ پس شددنا اسرھم کے معنی ہوں گے ان کے جوڑوں کو مضبوط بنایا۔ ابوعبید نے کہا فرس شدید الاسر کہا جاتا ہے یعنی خلق اور ابن زید نے کہا الاسر کے معنی ہیں القوۃ اور اسے الاسار سے مشتق کیا گیا ہے۔ اور وہ "قد" ہے یعنی تسمہ جس کے ذریعہ پالان کو باندھا جاسکتا ہے۔ اور معنی یہ ہیں کہ ہم نے ان کے جوڑ اور جڑیں مضبوط بنائے ہیں۔ اور ہم نے انہیں بہترین خلق بنایا ہے۔ وَاِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِيْلًا (ترجمہ:۔ اور جب ہم چاہیں

انہیں جیسوں سے تبدیل کر سکتے ہیں) یعنی جب ہم چاہیں ان کی امثال یعنی شباہتیں تبدیل کر دیں اور انہیں بُری صورتوں والا بنا دیں۔ اور بُری خلقت والا بنا دیں۔ ابن زید اور ابن جریر نے کہا کہ جب چاہیں ان کے سواء دوسری قوم لے آئیں جیسا کہ اللہ نے فرمایا ان یشاء یذهبکم ایها الناس ویات بآخرین وکان الله علی ذالک قدیرا۔ (النساء ۱۳۳) اور جیسے کہ فرمایا ان یشاء یذهبکم ویات بخلق جدید وما ذالک علی الله بعزیز۔ (ابراہیم ۱۹) امام رازی نے کہا اس کے معنی ہیں کہ جب ہم چاہیں انہیں ہلاک کر دیں گے۔ اور لے آئیں گے ان کے جیسے تو ہم انہیں ان کا بدل بنا دیں گے اور اسی سے اللہ کا قول ہے۔ علی ان نبدل امثالکم (الواقعة ۶۱) الغرض اس سے استثناء التام ہے گویا کہا گیا ہے اور مخلوقات میں سے کسی ایک سے ہماری کوئی حاجت نہیں الغرض حاجت ثابت ہو جائے تو پھر بھی ہمیں ان کی کوئی حاجت نہیں ہم ان کے فنا کر دینے پر اور ان جیسوں کی ایجاد پر قادر ہیں۔ زمخشری نے کہا انّ جب محقق شئے پر استعمال ہو تو اس کا وجود واقع ہوتا ہے۔ اور شئے کے لئے اس میں وجود ممکن ہوتا ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے امثال کو تبدیل کرنا نہیں چاہا پس اس کلام میں حق یہ تھا کہ اسے ان کے ساتھ لایا جاتا اذا کے ساتھ نہیں۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے "وان تتولوا یستبد قوما غیر کم" (محمد ۳۸) اور ان یشاء یذهبکم۔ ابوحیان کہتے ہیں لیکن اذا کو ان کی جگہ اور ان کو اذا کی جگہ پر لایا جاتا ہے جیسا ارشاد ربانی ہے افإن مت فهم الخالدون ۔ (الانبیاء ۳۴)

(۲۹) اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ (ترجمہ:۔ بلاشبہ یہ یاددہانی ہے) یعنی یہ سورۃ تذکیر و موعظۃ ہے غافل کے لئے۔ اور اس تذکرہ میں صالح عاقل کے لئے بے شمار فوائد ہیں۔ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا۔ (ترجمہ:۔ تو جو کوئی چاہے اپنے پروردگار کی جانب راہ اختیار کر لے) یعنی جس نے تذکرہ قدسیہ اختیار کر لیا تو اس طریقہ سے وہ اپنے رحیم و کریم پروردگار سے مل جائے گا۔

(۳۰) وَمَا تَشَآءُوْنَ (ترجمہ:۔ اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے) اللہ کی جانب راستہ صرف اپنی رائے کی بہتری اور اپنی تدبیر کے صلاح سے۔ کیونکہ بحیثیت ممکن ہر امر میں واجب تعالیٰ کا محتاج ہوتا ہے پس وہ کسی ایسے فعل پر قادر نہیں ہو سکتا جو اس کے حال اور مآل کی اصلاح کر سکے۔ صاحب کشاف نے کہا اتخاذ سبیل (راستہ کی اختیاری) اللہ کے تقرب اور اطاعت سے توسل سے عبارت ہے اور تم نہیں چاہو گے طاعت سوائے اس کے اگر اللہ چاہے تو تمہیں اس پر مجبور کر دے۔ اس میں معتزلہ کا وسوسہ ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ شقی ہدایت کو قبول کرنے سے پہلے کے اعتبار سے شقی ہوتا ہے پس قبولیت سے پہلے اس کی طبیعت اسے تنہا نہیں چھوڑتی کہ ہدایت قبول کرنے والا ہے یا نہیں ہے۔ پس اگر اول بات ہو تو اس کے لئے مجبور کر دینے کی حاجت نہیں کیونکہ ارشاد اور اراءۃ اس کے لئے کافی ہے۔ اور اگر دوسری بات ہے تو اسے بھی مجبور کر دینے کی حاجت نہیں کیونکہ فطرت کی تبدیلی یا حدوث المشیہ کو واجب کرتی ہے اور ان دونوں کا بطلان واضح ہے۔ جہاں تک پہلے کا تعلق ہے تو اس کے لئے اللہ نے کتاب المحکم میں فرمایا لا تبدیل لخلق الله (الروم ۳۰) اور جہاں تک دوسرے کا تعلق ہے تو اللہ نے کتاب مجید میں فرمایا ولو شاء لهدا کم اجمعین (النحل ۹) اور یہ زیادہ واضح دلیل ہے کہ اللہ کی مشیت میں تجدید باطل ہے اور مجبور کرنے کا قول بھی باطل ہے۔ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (ترجمہ:۔ سوائے اس کے کہ جو اللہ چاہے) یعنی

صرف اللہ کی مشیت کے وقت ہی تم چاہتے ہو۔ زجاج نے کہا یعنی تم نہیں چاہتے ہو مگر اللہ کی مشیت کے ساتھ پس جو معتزلہ نے کہا وہ باطل ہو گیا اور جبریہ نے کہا کہ یہ قول اس بات کا مقتضی ہے کہ اللہ کی مشیت بندے کی مشیت کو مستلزم ہے اور مستلزم کا مستلزم، مستلزم ہی ہوتا ہے۔ پس اس صورت میں اللہ کی مشیت عبد کے فعل کو مستلزم ہو گئی یہی تو وہ جبر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ قول ضعیف ہے اس لئے کہ اللہ کی مشیت بندے کی قدرت کا مسبب ہے اور اس کی قدرت اللہ کی قدرت بعینہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ بندے کے ارادے کی تابع ہوتی ہے۔ اور اس کا ارادہ اس کے مزاج کا تابع ہوتا ہے۔ پس اللہ نے جس پر صلاح اور خیر کی مہر لگا دی اس سے وہ فعل صادر ہوتا ہے جو اس کی صلاح کا مقتضی ہوتا ہے۔ اور جس پر اللہ نے گمراہی اور شر کی مہر لگا دی اس سے وہی فعل صادر ہوتا ہے جو اس کی گمراہی اور اس کے شر کا طالب ہوتا ہے۔ پس وہ قدرت جس کے وجود سے بندے سے افعال صادر ہوتے ہیں وہ اللہ کی نفس قدرت نہیں ہے۔ اور اسی مقصد کی طرف اللہ نے اشارہ کیا ہے اپنے اس قول میں **فمن شاء فليومن ومن شاء فليكفر**۔ (الکہف ۲۹) ابوعمرو البصری، کسائی اور ابن کثیر مکی نے **وما يشاؤن** یائے غیبت کے ساتھ پڑھا۔ اور باقی قراء سبعہ نے تائے خطاب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس میں غائب سے خطاب کی طرف التفات ہے اور عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا **الا ما يشاء الله** کے معنی ہیں "**الا وقت مشية الله**" جیسا کہ ہم نے ذکر کیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "**ان يشاء الله**" ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہو اور یہ وہ ہے جو صاحب الکشاف کی رائے ہے۔ ابوحیان نے کہا ہم تصور کرتے ہیں یہ مقام ظرف نہیں ہے بلکہ **مصدر مصرح به** ہے جیسے کہ آپ کہتے ہیں "**اجئتک صباح الديک**" اور وہ **اجيئک ان يصيح الديک** کو جائز نہیں رکھتے اور نہ ہی **اجيتک ما يصيح الديک**۔ پس اسی بناء پر زمخشری نے جو کہا وہ جائز نہیں ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ مذہب صاحب الکشاف ہے کہ مصدر مصرح جیسے کہ قیام اور مصدر غیر مصرح جیسے کہ "**ان يقوم**"۔ اس حکم میں برابر ہیں ۔ **اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا** (ترجمہ:۔ بے شک اللہ جاننے والا ہے) یعنی اپنی کل مخلوق کا حال جانتا ہے **حَكِيْمًا** (ترجمہ: حکیم ہے) اور تمام امور میں **بليغ الحكمة** ہے

(۳۱) **يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ** (ترجمہ:۔ جس کو چاہتا ہے اسے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے) اور وہ مومنین ہیں۔ **وَالظّٰلِمِيْنَ اَعَدَّلَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا** (ترجمہ:۔ اور ظالموں کے لئے اللہ نے درد ناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔) اور **الظالمين** فعل مقدر کی وجہ منصوب ہے اور وہ ہے **يعذب** یعنی وہ ظالموں کو عذاب دیگا اور اسی پر اللہ کا یہ قول ہے **وهو اعدّلهم**۔ اور یہ جمہور کی قراءت ہے۔ اور ابن زبیر اور ابان بن عثمان اور ابن ابی عبلۃ نے **والظالمون** پڑھا ہے۔ جملہ فعلیہ پر جملہ اسمیہ کا عطف ہے۔ اور وہ اللہ کا قول "**يدخل في رحمته**" الخ ہے۔ اور یہ جائز ہے اور عبداللہ نے **و للظالمين** لام جرّ کے ساتھ اور جو **عدّلهم** سے متعلق بطور تو کید ہے۔ قدوۃ المفسرین محمد بن جریر طبری نے کہا کہ عرب اس طرح کیا کرتے تھے اور بعض کے لئے اس طرح کہتے تھے۔

اقول لها وقد سالت طلاقا الى ماتُسر عين الى فراق

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ جنت و دوزخ میں داخلہ صرف مشیت الٰہی پر موقوف ہے نہ کہ بندے کے استحقاق پر